# امریکی حکمت عملی: تبدیلی کے عمل میں پاکستان کی مدد

تحریر: آشلے جے ٹلس*

ترجمہ: فیضان اللہ خان، خورشیداحمد سعیدی

آج پاکستان واضح طور پر بیک وقت مسئلے کا حصہ بھی ہے اور دہشت گردی کے اس خطرے کا حل بھی اس کے پاس ہے جس کا ریاست ہائے متحدہ کو سامنا ہے۔ ۱۱/۹ کمیشن نے ۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حادثے کے بارے میں جو مشہور و معروف رپورٹ تیار کی، اس کے آغاز میں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن اس کا اختتام بین الاقوامی دہشت گردی میں پاکستان کے گہرے عمل دخل کے تذکرے سے کیا گیا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے آغاز میں بھارتی پنجاب میں سکھوں کی تحریک کے سر اٹھانے سے لے کر اب تک دو عشروں کے دوران میں اسلام آباد، افغانستان اور بھارت کے مقابلے میں اپنے جیو پولیٹکل مفادات حاصل کرنے کے لیے شعوری طور پر دہشت گرد گروہوں کی پرورش اور حمایت کرتا رہا۔ اگرچہ ۱۱ ستمبر کے حملوں کے بعد اسلام آباد نے افغانستان میں طالبان حکومت کو ختم کرنے اور القاعدہ کی باقیات کو تلاش کرنے میں واشنگٹن کے ساتھ تعاون کا مشکل فیصلہ کیا لیکن افسوس کہ صدر جنرل پرویز مشرف کی حکومت ریاستی پالیسی کے طور پر دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کرنے سے مکمل طور پر باز نہیں آئی ہے۔ بدقسمتی سے ۱۱/۹ کمیشن کی رپورٹ اس حقیقت سے چشم پوشی کرتی ہے۔

اگرچہ ۱۱/۹ کے فوراً بعد پرویز مشرف نے دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے سلسلے میں جو جرأت مندانہ فیصلے کیے ان کو بجا طور پر سراہا گیا ہے، تاہم اب بھی پاکستان اپنی شمال مغربی سرحد کے علاقے میں طالبان کا پیچھا کرنے سے جان بوجھ کر غفلت برت رہا ہے اور کشمیر میں سرگرم مختلف دہشت گرد گروہوں کی حمایت جاری رکھے ہوئے ہے۔ چنانچہ ۱۱ ستمبر کے واقعے کے بعد پاکستان کی سٹریٹجک سمت

*Ashley J. Tellis, "US Strategy: Assisting Pakistan's Transformation", *The Washington Quarterly*, Winter 2004-05, pp. 97-116

میں آنے والی کئی خوشگوار تبدیلیوں کا دائرہ اثر اتنا وسیع نہ تھا کہ دہشت گردی سے مکمل لاتعلقی اس کی قومی پالیسی کے ایک اہم عنصر کے طور پر سامنے آسکتی۔ اسلام آباد اب بھی اپنے جیو پولیٹکل مفادات کے حصول کے لیے، جنہیں وہ اہم گردانتا ہے، دہشت گرد تنظیموں کی حمایت کر رہا ہے۔ مثلاً افغانستان میں دوستانہ، بلکہ ایک تابعدار حکومت کا قیام اور بھارت سے کشمیر کو چھین لینا۔

اگرچہ ان مقاصد میں پاکستان کا دلچسپی لینا سمجھ میں آتا ہے۔ کیونکہ خود اسلام آباد اس بارے میں پر یقین نہیں ہوسکتا کہ اس نے جن انتہا پسند قوتوں کو بے لگام چھوڑ رکھا ہے، ان پر مستقبل میں اس کی گرفت ویسی ہی مضبوط رہے گی یا نہیں؟ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اسلام آباد نے آج جن دہشت گرد تنظیموں کو اپنے سٹریٹجک مفادات کی خاطر پروان چڑھایا ہے، وہ آخرکار خود پاکستانی ریاست کے خلاف کھڑی ہو سکتی ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی بعض صورتوں میں ہو چکا ہے۔ اس ممکنہ صورت حال میں اس بڑے گنجان آباد اور نیوکلیائی قوت سے لیس مسلمان ملک کے لیے بڑے سنگین نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ پرتشدد اور دقیانوسی فکر اسلامی (آئیڈیالوجی)، جو پاکستان کی حمایت یافتہ کئی دہشت گرد تنظیموں کے متحرک ہونے کا باعث ہے انہیں ریاست ہائے متحدہ کا ایک قدرتی مخالف بنا دیتا ہے اور نتیجے کے طور پر نہ صرف امریکہ بلکہ بھارت اور افغانستان کے مفادات پر حملوں کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

لہٰذا پاکستان کی جانب سے امریکی تحفظ کو بالخصوص اور تمام مغربی ممالک کے مفادات کو بالعموم جو مسلسل خطرہ لاحق ہے، اس کا رخ موڑنے کے لیے پاکستان میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ اس عمل میں پاکستان کی مدد کرنا امریکہ کے لیے ایک انتہائی مشکل چیلنج ہے۔ پاکستان نے مسائل سے دوچار اپنی پچاس سالہ ریاستی زندگی کے دوران میں سٹریٹجک، اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کا ایک انبار اکٹھا کر لیا ہے جو نہ صرف انفرادی حیثیت سے نہایت خطرناک ہیں بلکہ یہ سب ایک دوسرے کے شیطانی اثرات کو بڑھانے میں مدد و معاون ہیں۔ یکے بعد دیگرے آنے والے پاکستانی حکمران اصلاح کے عمل کو سنجیدگی سے آگے بڑھانے میں ہچکچاتے رہے ہیں۔ کیونکہ قومی بحران کی گھمبیر نوعیت نے قطعی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس ملک کے حالات میں جزوی بہتری لانے کے لیے بھی وسیع پیمانے پر انقلابی تبدیلی لانا ناگزیر ہے۔ چنانچہ وہ روایتی انداز میں اصلاح کی ایسی کوششوں پر مطمئن ہو گئے جن میں یکسوئی تھی نہ

مستقل مزاجی اور نتیجتاً کوئی بھی کوشش ان کی حکومت کے خاتمے کے بعد برقرار نہ رہ سکی۔

ابھی تک صدر مشرف نے اپنے رویے سے اس بات کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا ہے کہ وہ مذکورہ بالا اصول سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ جن ساختی تبدیلیوں کا اہتمام کر رہے ہیں، ان کا بنیادی مقصد ان کی اپنے اقتدار پر گرفت مضبوط کرنا ہے اور پالیسی کی بہتری کے لیے کی جانے والی اصلاحات کے لیے اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ ان کی مدت اقتدار کے بعد بھی برقرار رہیں گی۔ ''روشن خیال اعتدال پسندی'' (Enlightened Moderation) کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے البتہ مشرف صاحب نے بعض اداروں کی نشو ونما اس نہج پر کی ہے جہاں مستقبل میں جمہوری اداروں اور اعتدال پسند جمہوری قوتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا۔ اس کے برعکس دوسری طرف ان کی سیاسی چالوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اعلیٰ ترین قانون ساز ادارہ میں مذہبی سیاسی پارٹیوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اور ساتھ ہی مذہبی سیاسی قوتوں کے اثر سے ریاست کو طویل المدت بنیادوں پر محفوظ رکھنے کے لیے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ قومی سیاست میں فوجی برتری اور مداخلت کا سلسلہ جاری رکھا جا سکے۔

پاکستان کی کہانی کو کامیاب بنانے کے لیے درکار بیشتر تبدیلیاں خود اہل پاکستان کو لانا ہوں گی اور ان پر عمل درآمد کرنا ہوگا۔ بیرونی عناصر جن میں امریکہ جیسے طاقتور حلیف شامل ہیں محض ایک مددگار کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ پاکستان کو کامیاب تغیرات سے ہمکنار کرنے کے لیے پاکستانی رہنماؤں کو مشکل راستوں کا انتخاب کرنا ہوگا جن میں وسیع تر قومی مفادات کی خاطر بعض فوری اور اکثر اہم آئینی مفادات کو ثانوی اہمیت دینا ہوگی۔ تاہم ماضی میں ایسے لیڈر بہرحال گزرے ہیں جنہوں نے ایسے چیلنجوں کو قبول کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے تاہم موجودہ فوجی قیادت سے ایسی توقع کرنا عبث ہے۔ جنرل پرویز مشرف نے کچھ عرصہ قبل پاکستان کی بڑی سیاسی جماعتوں کے ساتھ چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے سے دست بردار ہونے کا جو معاہدہ کیا تھا، اس پر عمل درآمد کرنے سے ان کا انکار اس بات کی تازہ ترین مثال ہے کہ کس قدر قلیل المدت اور بعض اوقات ذاتی نوعیت کے مفادات اب بھی عوامی اہمیت کے بڑے مسائل پر فوقیت رکھتے ہیں۔ مشرف کے اس فیصلے سے ملک میں جمہوری نظام کی طرف واپسی کے عمل میں مزید رکاوٹ پیدا ہوئی اور ایک نہایت محترم اور اصلاح پسند جرنیل محمد یوسف خان کے لیے بری

فوج کے اعلیٰ ترین عہدے پر پہنچنے کا راستہ بند ہوا۔ پاکستان کو ایک ایسی ریاست میں تبدیل کرنے کے لیے جو مستحکم بھی ہو اور جس سے کسی اور ملک کو کوئی خطرہ بھی نہ ہو، اس کے اہم اتحادیوں، جیسے امریکہ کو بھی طویل المدت فوائد حاصل کرنے کے لیے بعض اہم لیکن قلیل المدت مفادات کی قربانی دینے پر آمادگی ظاہر کرنا ہوگی۔ چونکہ اس قسم کا تغیر لازماً اس بات کا متقاضی ہے کہ پاکستان میں ایک ایسی مکمل جمہوری حکومت قائم ہو جس میں فوج ریاست کے پاسبان کا کردار ادا کرے نہ کہ آقا کا۔ لہٰذا اصل سوال یہ ہے کہ آیا واشنگٹن اور ایسے دوسرے ممالک کے دارالحکومتوں میں اتنی دوراندیشی، حسنِ تدبیر اور سیاسی عزم ہے کہ وہ ایسی پالیسیوں پر گامزن رہیں جن سے اسلام آباد مطلوبہ سمت میں آگے بڑھ سکے اور ساتھ ہی دہشت گردی سے جنگ لڑنے میں اس کا تعاون بھی حاصل رہے۔

## بحران کا تجزیہ

۱۹۴۷ء کی خونی تقسیم کے بعد پاکستان نے اپنے آپ کو ایک انتہائی غیر محفوظ حالت میں پایا۔ اس کی ریاست دو حصوں میں منقسم تھی۔ اس کی انتظامیہ معاملات کو صحیح طرح چلانے سے قاصر تھی، اس کی اقتصادی حالت دگرگوں تھی، اور پھر جلد ہی اسے اپنے بڑے ہمسائے بھارت کے ساتھ کشمیر کے مسئلے پر جنگ بھی لڑنا پڑی۔ اپنی آزادی کے دس سال بعد تک پاکستان کو آئینی جمہوری نظام قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑی۔ جمہوری طرز حکومت کے عالمی اصول، یعنی بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کو، جو اکثریت میں تھے، ملک کے مغربی حصے میں اثر و رسوخ رکھنے والے مہاجروں اور پنجابیوں پر حکومت کرنے کا حق ملنا چاہیے تھا۔ لیکن چونکہ ان دونوں گروہوں کو اس حقیقت کے نتائج قابل قبول نہیں تھے، اس لیے کئی آئینی مسودوں کو اسی بنا پر مسترد کر دیا گیا اور یوں ملک میں جمہوری اداروں کے قیام کا راستہ ہمیشہ کے لیے مسدود ہو گیا۔ کیونکہ نسلی اور نوکرشاہی طبقات سے تعلق رکھنے والے خواص (elite)، جنہوں نے پاکستان کے سیاسی خلا کو چھینا جھپٹی کے ذریعے جلدی جلدی پر کر دیا تھا، کھیل کے اپنے اصول و ضوابط اختراع کر لیے تھے جو آئندہ کئی عشروں تک پاکستانی جمہوریت کی جڑوں کو کھوکھلا کرتے رہے۔

مزید برآں چند مسائل ایسے تھے جنہوں نے باہم مل کر بے چینی پیدا کرنے والے چند پیچیدہ ذرائع کو جنم دیا جو آج تک چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک انگریز حکومت کے زمانے کی روایت تھی یعنی نوکر شاہی کا تسلط، جو انگریزوں کے دورِ اقتدار میں یہاں کی علاقائی ریاستوں کی خصوصیت تھی۔ بعد میں انہی ریاستوں میں سے بیشتر مغربی پاکستان میں شامل ہو گئیں۔ دوسرا مسئلہ پاکستان کو وجود میں لانے اور اس کے وجود کو جائز قرار دینے کے عمل میں اسلام کا کردار تھا۔ تیسرا مسئلہ مرکز اور صوبوں کے درمیان حریفانہ کشاکش تھی اور چوتھا مسئلہ منتخب عہدے داروں اور غیر منتخب نوکر شاہی کے اختیارات میں عدم تناسب تھا۔ آزادی کے بعد پاکستان کے اہم تشکیلی برسوں کے دوران میں ان اساسی مسائل کو حل کرنے میں ناکامی ہوئی جس نے ان بنیادوں کو کمزور تر کر دیا جن کے اوپر ایک جمہوری سیاسی نظام کی عمارت کھڑی کی جا سکتی۔ لہٰذا اس میں اچھنبے کی کوئی بات نہیں تھی کہ ۱۹۵۸ء میں پاکستان کے پہلے مسودۂ آئین کو اس کی اشاعت کے صرف دو سال بعد فوجی انقلاب کے نتیجے میں منسوخ کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کی بدولت پاکستان کی سیاست میں آنے والا بگاڑ ایک مستقل شکل اختیار کر گیا۔

پاکستان کے سیاسی اقتدار پر فوج کے پہلے غاصبانہ قبضے کا مقصد بدنیتی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل ملک کے اندرونی نظام کے درہم برہم ہونے کے اثرات ملک کے دفاع پر بھی پڑے۔ فوج کے اقتدار کا بنیادی اور فوری مقصد اس دفاعی کمزوری کی اصلاح تھا۔ دفاع کی طرف حکومت کی عدم توجہی کا سبب سیاست، فکری اختلافات اور بین الصوبائی جھگڑوں کے علاوہ بھارت کی جانب سے دی جانے والی دھمکیاں بھی تھیں۔ تاہم زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ پاکستان کی فوج، جو سرد جنگ کے ابتدائی دنوں میں امریکہ کی جانب سے ملنے والی حمایت کے سبب نڈر ہو چکی تھی اور بھارت سے کشمیر لینے کا تہیہ کر چکی تھی، ملک کے محافظ کے طور پر اپنے سابقہ غیر سیاسی کردار سے دست بردار ہو گئی اور محض ایک مفاد پرست گروہ کی حیثیت اختیار کر گئی جس کا مقصد خود ریاست کے اوپر اپنا کنٹرول برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کرنا تھا۔ اس کے بعد آنے والے ہر فوجی انقلاب نے جس کے لیے اس وقت کے اندرونی و بیرونی خطرات کا عذر پیش کیا گیا۔ موجودہ سیاسی اختلافات کو ہوا دے کر اور مزید اختلافات کو جنم دے کر اس مسئلے کو پیچیدہ تر بنا دیا۔

فوج نے قوم کی اندرونی و بیرونی سلامتی کی پالیسیوں، قومی بجٹ کے بڑے حصے، وسیع سیاسی و

اقتصادی پشت پناہی اور ریٹائرڈ فوجی افسروں کی سربراہی میں کاروباری اداروں کے ایک بہت بڑے نیٹ ورک کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ طاقت کا یہ ارتکاز ہی پاکستان میں جمہوریت پر مہلک ضرب لگانے کے لیے کافی تھا، لیکن جب اس کے ساتھ پاکستان کا یہ انتقامی نقطۂ نظر بھی شامل ہو گیا کہ بھارت سے جو ایک بڑی اور زورآور طاقت ہے، کشمیر کو زبردستی چھین لیا جائے تو یہ پاکستان کے اندرونی استحکام کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جوں جوں پاکستان ایک ایسی فوجی چھاؤنی میں تبدیل ہوتا گیا جس کی معیشت ایک جنگی معیشت تھی۔ یہ انتہا پسند گروہوں کی نشوونما کا مرکز بھی بنتا گیا جن میں سے اکثر فوج نے مختلف مقامی اور خارجہ پالیسی سے متعلق چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے پروان چڑھائے تھے۔ جیسا کہ ٹیریسٹا شافر (Teresita Schaffer) نے مختصر الفاظ میں نتیجہ اخذ کیا ہے:

''پاکستان کی سیاسی بقا کو خطرے میں ڈالنے والی سب سے بڑی رکاوٹ فوج کا کردار ہے''۔

پاکستان کا بحران بہت وسیع الاطراف ہے۔ اگرچہ سٹریٹجک، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی رکاوٹیں موجود ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے مخصوص اسباب ہیں۔ تاہم بطور مجموعی یہ تلخ حقیقت بڑی واضح ہے کہ پاکستان فوجی حکومت کی مدد کے بغیر اپنے اندرونی و بیرونی مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اندرونی عدم استحکام کا مقابلہ کرنے کے لیے جمہوری سیاست کو جاندار بنانا، اقتصادی نشوونما کا رخ ترقیاتی مقاصد کے حصول کی جانب کرنا، بین الصوبائی عدل کو یقینی بنانا اور ایک قومی شناخت کو پروان چڑھانا ضروری ہے جس کی جڑیں نہ تو انتہا پسندانہ اسلام میں ہیں اور نہ بھارت کے ساتھ دوطرفہ مخاصمت میں۔ بیرونی تحفظ کو لاحق خطرات سے نمٹنے کے لیے نئی دہلی کے ساتھ ایک سمجھوتہ ہونا ضروری ہے جس سے پاکستان کا وقار بھی قائم رہے اور کشمیر کا تکلیف دہ مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ اب تک پاکستان کی فوجی حکومتیں ان میں سے کوئی ایک بھی مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔

چنانچہ اکثر مبصرین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ پاکستان اس وقت تک انتظام حکومت، اقتصادی بندوبست اور غیر ملکی واسٹریٹجک پالیسی میں اپنی کثیر پہلو ناکامیوں سے نجات حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ ملک میں غیر فوجی جمہوری حکومت بحال نہیں ہو جاتی جو ایک آئینی فریم ورک کے ماتحت ہو اور جس میں چیک اینڈ بیلنس کا معقول اہتمام کیا گیا ہو۔ پاکستان کے پیچیدہ مسائل کو ٹکڑوں میں حل کرنے کی ہر

کوشش محض عارضی نتائج پیدا کرے گی۔ اس کے بجائے مسئلے کا حل اس بات کا متقاضی ہے کہ ٹھوس بیرونی امداد فراہم کی جائے۔ جمہوری نظامِ حکومت کو حقیقی بنیادوں پر آگے بڑھانے کے لیے پُرعزم کوشش کی جائے جو فوجی مداخلت اور وقت کی قید سے آزاد ہو۔

## کیا کیا جاسکتا ہے؟

دوسرے ممالک محدود مگر بہت اہم امور میں معاونت تو مہیا کر سکتے ہیں لیکن اپنے ملک کے مسائل کے حل کے لیے خود پاکستانیوں کو راستے وضع کرنے ہوں گے۔ مختلف اداروں کے قیام، استحکام اور ان کی نشوونما کا مسلسل عمل ہی کسی ملک کی مضبوط اساس کا ضامن قرار پاسکتا ہے۔ حتمی اور پائیدار حل کے لیے چار بنیادی شعبوں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا جن میں پاکستان کے لیے بہت مشکل چیلنج موجود ہیں: اسٹریٹجک، معاشی، سیاسی اور سماجی۔

**اسٹرٹیجک: درپیش چیلنج:** پاکستان بھارت کے ساتھ مستقل طور پر حالتِ جنگ میں ہے، یہ بھارت کے قدرتی غلبے سے خوف زدہ ہے لیکن یہ اس کی کمزوریوں کا استحصال کرتے ہوئے نئی دہلی کی نقصان پہنچانے کی صلاحیت کو محدود کیے رکھنے کے لیے پُرعزم ہے۔ حالیہ دہائیوں میں پاکستان نے بھارت کے اندر کئی شورشوں اور بغاوتوں کی حمایت کر کے اس کی ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسے یہ توقع تھی کہ نئی دہلی پاکستان کے خلاف آرمی ایکشن کے ذریعے بدلہ نہیں لے سکے گی کیونکہ اس عمل کے باعث وسیع ایٹمی تباہی کے شعلے بھڑک اٹھنے کا ڈر ہے۔ اس حکمت عملی نے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں (WMD) کے حصول کے پاکستانی عزم کو مزید مضبوط کیا ہے تاکہ کشیدگی کی کسی بھی سطح پر بھارت کو باز رکھا جاسکے اور شکست دی جاسکے خواہ وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ان ہتھیاروں کا حصول اس قیمت پر ہی کیوں نہ ہو جہاں ان کے ''غیر محفوظ ہاتھوں تک رسائی'' کے عالمی خدشات کا اظہار ہونے لگے۔

نئی دہلی سے مقابلے کی فضا نے بھی اسلام آباد پر دباؤ ڈالا ہے کہ وہ بھارت کو افغانستان میں اپنا اثر بحال کرنے سے روکے۔ اگر افغانی صدر حامد کرزئی کی حکومت بھارت کے مفادات کا بہت دوستانہ انداز

میں تحفظ کرتی ہے تو ایک دور رس حکمتِ عملی کے تحت پاکستان نے صوبہ سرحد میں طالبان کی باقیات کو حفاظتی ڈھال کے طور پر رکھا ہوا ہے اور اس سے بڑھ کر آخری بات یہ کہ بدنظمی پر مبنی تاریخ کے نتیجے میں پاکستان اپنے بیرونی حامیوں کو آج آسانی مہیا کرنے والے انتہائی عارضی وسائل سمجھتا ہے کیونکہ ان کے مفادات زیادہ تر ان کی اس صلاحیت پر منحصر ہیں جس سے وہ اسلام آباد کی بھارت کے ساتھ مسلسل کشمکش کے حوالے سے مدد کرتے ہیں۔ اس لیے حکمت عملی کے دائرے میں بنیادی چیلنج پاکستانی فوج کے اس تصور کو معتدل کرنا ہے جس کے باعث وہ بھارت کے ساتھ مستقل اور ناگزیر کشمکش کی حالت میں رہتی ہے۔

اس تصور میں پختگی نے پاکستانی فوج کو کئی پُرخطر اور غیر مستحکم حکمت عملی پر مبنی اقدامات اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ ان میں گزشتہ پچاس سالوں کے دوران ہونے والی دہشت گردی اور جنگیں شامل ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ فوج نے کئی بار جبراً سیاسی اقتدار چھینا ہے اور معیشت پر بوجھ بڑھایا ہے۔ اسلام آباد میں ایک مستحکم سول حکمرانی کی بحالی کافی حد تک اس مسئلے کو آسان بنا دے گی۔ تاریخی طور پر پاکستان میں سول حکومتیں بھارتی خطرے کے سامنے اپنے فوجی ہم منصبوں کے مقابلے میں کم پریشان رہی ہیں۔ اگر چند ایک موقعوں پر اسلام آباد کی سول حکومتیں بھارت کے ساتھ تحفظ کے سنجیدہ مقابلے میں مصروف ہوئیں بھی تو اس کا سب سے بڑا مقصد فوج کو تسلی دینا تھا تا کہ اپنی حکمرانی میں وہ فوج کے عمل دخل کے امکانات کو کم کر سکیں۔

سول حکمرانی کی بحالی کے بعد بھی حکمت عملی کے میدان میں پاکستان کو بعض خاص اقدامات کرنے کی ضرورت ہوگی۔ جن میں دہشت گرد گروپوں کے لیے پاکستانی ریاستی حمایت کو ختم کرنا شامل ہے۔ ان گروپوں میں وہ گروپ شامل ہیں جو افغانستان اور کشمیر میں کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ان اقدامات میں بھارت کے ساتھ سفارتی مکالمے کے ذریعے کشمکش کو دور کرنا اور ہم آہنگی کی فضا قائم کرنا؛ ایٹمی مواد کے پھیلاؤ کو کنٹرول کرنے کا پروگرام وضع کرنا؛ پاکستان کے ایٹمی ذخائر کی سکیورٹی کو بڑھانا اور امریکہ پاکستان تعاون کو ترقی دینا شامل ہیں۔

**معاشی چیلنج:** پاکستان کو درپیش معاشی چیلنج اتنے پیچیدہ اور باہم اتنے مربوط ہیں کہ صرف چند پیراگراف پر پھیلا ہوا خلاصہ ایک مکمل حل پیش نہیں کر سکتا۔ اس لیے ذیل میں اس کا ایک جزوی خاکہ اور

جھلک پیش ہے۔ بھارت کے ساتھ نہ ختم ہونے والی کشمکش نے ایک جنگی معیشت کو جنم دیا ہے جس میں سماجی، ترقیاتی اور انسانی سرمایہ کاری کی قربانی دے کر بھاری فوجی اخراجات کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ان اخراجات کا جو کہ مجموعی قومی پیداوار اور مرکزی حکومت کے کل اخراجات کا بہت بڑا حصہ ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ مجموعی اور شخصی بچتوں کی شرح اور شرح پیداوار بہت کم ہے۔ یہ رجحان ۱۹۹۰ء کے عشرے میں بہت واضح تھا۔ کم بچتوں کی وجہ سے بھاری دفاعی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے بیرونی قرضے لینا ناگزیر ہو گیا تھا جس سے سود وغیرہ کی مجموعی رقم بڑھ جانے کی وجہ سے بچتوں اور سرمایہ کاری میں مزید رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ جب حکومت نے تعلیم اور صحت جیسے میدانوں میں سرمایہ کاری کم کر کے سماجی فلاح و بہبود کو نظر انداز کیا تو اس خلا کو پُر کرنے اسلامی اداروں کو موقع مل گیا اور اس سے مسائل اور بڑھ گئے۔ اس کے علاوہ فوج بھرتی اور سماجی سطح پر تعاون کے لیے زرعی جاگیرداروں پر بھروسہ کرتی اور ان کے ساتھ تعلقات قائم رکھتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ زرعی ٹیکس ادا کرنے اور زرعی اراضی کی اصلاحات پر راضی نہیں ہیں حالانکہ اس سے گورنمنٹ کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ پاکستان کو دو بڑے معاشی چیلنجوں کا سامنا ہے۔ پہلا میکرو اکانومک مسئلے کی درستگی ہے جس نے پاکستان کی جنگی معیشت کو پیدا کیا ہے۔ اور دوسرا مسئلہ پائیدار اور قانونی اصلاحات کا ایسا نفاذ ہے جو اداروں کو ٹھوس بنیادوں پر استحکام عطا کر سکے، پیداواری شخصی رویوں کو مطلوبہ سمت دے سکے اور طویل المیعاد میکرو اکانومک کے نتائج کو بار بار کی ریاستی دخل اندازی کے بغیر قائم رکھ سکے۔ مشرف حکومت نے پاکستان کی میکرو اکانومک کارکردگی کی بہت اچھی اصلاح کی ہے۔ اس سے شرح پیداوار بڑھی ہے، مالی خسارے کم ہوئے ہیں، افراط زر کم ہوا ہے اور ٹیکسوں کی وصولی کافی ہوئی ہے۔ تین عناصر نے اس بہتری کے لیے نمایاں کردار ادا کیا ہے: بین الاقوامی مالی اداروں کی طرف سے مسلط نظم وضبط، آزادی کی بقا کے آپریشن سے متعلق امریکی معاشی امداد، اور پاکستان میں ساختی اصلاح کا آغاز۔

طویل المیعاد معاشی کامیابی، ساختی تبدیلی کی تکمیل پر منحصر ہو گی جس میں نئے ادارتی انتظامات کی تخلیق شامل ہے جو میکرو اکانومک رویوں کو تبدیل کرتے ہیں۔ یہ انتظامات تبھی قائم رہ سکتے ہیں اور دیرپا نتائج دے سکتے ہیں جب عوامی تائید کے ذریعے انہیں سندِ جواز حاصل ہو سکے۔ اگرچہ بین الاقوامی مالی

ادارے اور بیرونی حکومتیں جو مستقبل کی پاکستانی حکومتوں کو قائم کرتی ہیں، کے ساتھ ہوتے رہنے والے معاہدے جواز یا عدم جواز کے ایشو کو غیر موثر بنا سکتے ہیں لیکن کسی بھی نئے ادارتی انتظامات کی طویل المیعاد بقا زیادہ تر سیاسی ڈھانچے کی عوامی تائید پر منحصر ہوگی۔ اگرچہ سیاسی رضا مندی کے حصول کا عمل حقیقی ترقی کا سبب بنے گا۔ پھر بھی موجودہ معاشی کامیابی اس بات کی متقاضی ہے کہ پاکستانی حکومت سے دفاعی اخراجات میں کٹوتی کروائی جائے جبکہ زراعت میں سرمایہ کاری میں اضافہ؛ چھوٹی اور درمیانی درجے کی صنعتوں اور آبپاشی کے ذریعے دیہات میں سماجی اور معاشی تباہی کا رخ موڑنے، فراہمی روزگار کی سطح کو بلند کرنے، غربت کے خاتمے؛ تعلیم اور صحت پر اخراجات بڑھانے اور معاشرے میں سماجی تحفظ کے جال بچھانے کے کام اوّلین ترجیحات میں شامل ہوں۔ ایسے انتظامات کے لیے جوابدہی کرنے والے اداروں کی تعمیر ناگزیر قرار پائے گی۔

**سیاسی چیلنج:** سیاسی سطح پر بھارت کے بحیثیت ایک مستقل موجود خطرے کا تصور نہ صرف فوج کے سیاسی رابطوں کا جواز فراہم کرتا ہے بلکہ اس کا نتیجہ بالآخر جمہوری حکومتوں کے عدم استحکام کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس صورت حال نے ریاست کی اصولی، قانونی اور ادارتی بنیادوں کو تباہ کر دیا ہے۔ پاکستان میں یکے بعد دیگرے بنائے جانے والے آئین کی منسوخی نے حکمرانی کے لیے لازمی اور بنیادی تقدس اور تاثیر کو ختم کر ڈالا، عدلیہ کو مکمل طور پر بے وقعت بنا دیا اور ہر فوجی دست درازی کو ''نظریہ ضرورت'' کے تحت جائز قرار دینے پر مجبور کر دیا۔ اس سے ہر نیا لیڈر ملک کو بچانے کے نام پر آئین کو منسوخ کرنا جائز سمجھتا ہے۔

مزید یہ کہ فوجی حکومتوں نے اپنے دورِ اقتدار میں نہ تو سول حکمرانی کی طرف لوٹنے کے لیے موثر شرائط کو مستحکم کیا اور نہ ہی ایسے اداروں کو ترقی دی جو مستقبل میں فوجی مداخلت کو غیر ممکن بنا دیں۔ بلکہ انہوں نے تنقید کے مقابلے میں خود کو محفوظ بنانے اور کسی بھی متوقع عوامی چیلنج کو دبانے پر توجہ مرکوز رکھی۔ اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اپنے اقتدار کو طول دینے اور اپنے غیر قانونی قبضے کے خلاف عوامی شدت کو غیر موثر بنانے پر توانائیاں صرف کیں۔ فوجی حکومتوں نے پاکستان میں بار بار معتدل سماجی قوتوں اور سیاسی پارٹیوں کو نظر انداز کیا ہے اور ان کی بجائے جمہوریت مخالف انتہاء پسند سیاسی گروپوں کی حوصلہ

افزائی کی ہے۔ انہوں نے جان بوجھ کر غیر جماعتی لوکل گورنمنٹ کو مرکزی اور صوبائی اداروں پر فوقیت دی ہے کیونکہ اول الذکر سکیورٹی پالیسی، قومی بجٹ، اور معاشی تنظیم سے متعلق فوج کے بنیادی اغراض اور دلچسپیوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں بن سکتی۔

اگر پاکستان کو ایک اعتدال پسند مسلم ریاست بنانا ہے جو نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے ہمسایوں اور بین الاقوامی برادری کے لیے پرامن ہو تو اس کے سیاسی طریقہ کار کی اصلاح لازمی ہے۔ مستحکم اور کامیاب پاکستان کے لیے ایسی جمہوری حکومت کا تصور ناگزیر ہے جو ایک ایسے آئین کے تحت کام کرے جو چیک اور بیلنس کے حوالے سے مؤثر ہو۔ آزادانہ اور باقاعدہ انتخابات کے ذریعے بننے والی، آئین کی پاسداری پر یقین رکھنے والی اور فوج سے آئینی تحفظ پانے والی ایک سول حکومت ہی پاکستان میں انتہاء پسند اسلامی قوتوں کو کنارے لگانے کے لیے آگے بڑھ سکتی ہے۔

آج پاکستان کو درپیش بہت خوفناک چیلنجوں پر قابو پانے کے لیے صرف جمہوری اداروں کا قیام اور مستحکم سول حکمرانی ہی امید کی کرن پیش کر سکتی ہے۔ ان میں درج ذیل چیلنج شامل ہیں: بھارت کے ساتھ دفاعی معاملات کو حل کرنا جو فوج کو دہشت گرد اسلامی گروپوں کی حمایت پر مجبور کر دیتے ہیں؛ معاشی خرابیوں کو دور کرنا جو سماجی میدان میں سرمایہ کاری پر فوجی اخراجات کو ترجیح دیتی ہیں اور غیر مؤثر اسلامی گروپوں کو ابھرنے اور شدت پسند بننے کا موقع فراہم کرتی ہیں؛ اُن سیاسی کمزوریوں کو درست کرنا جس کے باعث فوج اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے اور ایک متحرک سول معاشرے میں کھلے مقابلے کے ذریعے متعین ہونے والے قومی مفادات کے حصول کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں جمہوریت کا احیاء یہ ضمانت فراہم نہیں کرتا کہ یہ اسے موجودہ دلدل کے شکنجوں سے نکال لائے گا۔ تاہم جمہوریت کی عدم موجودگی ان خطرناک ساختی رجحانات کے دوام کو یقینی بنا دے گی جو انجام کار ریاست کی تباہی پر منتج ہوں گے۔ مزید برآں جمہوری اصلاحات کے نفاذ کی سابقہ کوششوں میں ناکامی مستقبل میں کوششوں کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننی چاہیے۔ جمہوری سول حکمرانوں نے ۱۹۷۳-۱۹۷۷ء اور ۱۹۹۸ - ۱۹۹۹ء تک حکومت کی لیکن فوجی مداخلت کے خوف نے انہیں بنیادی طور پر اچھی حکومت کی بجائے اپنے تحفظ کی کوششوں تک محدود رکھا۔ پاکستان کی تاریخ میں اس جمہوری دور کے غلط

اقدامات کو جمہوریت کی بحالی کے خلاف دلیل کے طور استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ حکومت سے فوجی اجتناب کی اہمیت کو گھٹاتے ہیں۔

جمہوریت کو بحال کرنے کے لیے پاکستان کو کئی اہم اقدامات کرنے چاہئیں۔مثلاً ایک نئے آئین کی تشکیل کے لیے۱۹۷۳ء کے آئین پر بحث کے کنونشن کا انعقاد۔ کیونکہ ۱۹۷۳ء کا آئین وہ واحد دستاویز ہے جس نے تمام پاکستانی سیاسی پارٹیوں کی تجاویز کو اپنے اندر سمویا ہے اور اسے عالمی قبولیت حاصل ہوئی تھی۔ نئے آئین کی تشکیل اس لیے ضروری ہے کہ پاکستان کی سیاسی زندگی کو چلانے کے لیے اس ''بنیادی قانون'' کی اہمیت کو پھر اجاگر کیا جا سکے۔ اسی طرح ایک سچے اور اصلاحی پینل (اگر یہ ضروری ہو) کے ذریعے معتدل سیاسی پارٹیوں کی بحالی؛ صوبائی انتظامیہ میں وفاقی افسران کی مداخلت کے کردار کو ختم کرنا اور صوبائی حکومتوں کو مضبوط کرنا؛ سول حکومتوں اور قانون کی حکمرانی کی مدد کے لیے سول سروسز، عدلیہ اور پولیس کی اصلاح کرنا؛ اور مشرف کے سن ۲۰۰۰ء کے مقامی سطح کے منصوبے میں ترمیم کرنا جو مقامی حکومتوں کو زیادہ اختیار دیتا ہے تاکہ یہاں جماعتی بنیادوں پر انتخابات ہو سکیں، پارلیمانی جائزے کا معروف طریقہ جڑ پکڑ سکے اور مالی امور میں عدم مرکزیت کے رجحان کو تقویت حاصل ہو سکے۔

**سماجی چیلنج:** سماجی سطح پر فوجی حکمرانی کے مختلف ادوار نے خاص طور پر حالیہ عشروں کے دوران میں انتہاء پسند اسلامی عناصر کو بہت طاقتور بنا دیا ہے جنہیں اندرونِ ملک اعتدال پسند حزبِ مخالف کو کنارے لگانے اور بیرونی دنیا میں اسلام آباد کے علاقائی مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے بہت اچھا وسیلہ سمجھا گیا ہے۔لیکن اس کے باوجود اس صورت حال کی تنہا ذمہ داری فوج پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ پاکستان میں انتہاء پسند عناصر دراصل تقسیم کے وقت سے ہی موجود رہے ہیں چنانچہ بانئ پاکستان محمد علی جناح کی شعلہ سامان مہم ''اسلام خطرے میں'' نے مسلمان جہادیوں کی قوت کا استعمال کیا تاکہ انہیں قیام پاکستان کی یقین دہانی کروائی جا سکے۔ جب نئی ریاست قائم ہوگئی تو ایک بار جناح نے اس اندازِ فکر کو مسترد کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں آئین ساز اسمبلی کے سامنے اپنی تقریر میں انہوں نے پاکستانی عوام سے کہا: ''آپ کسی بھی مذہب، ذات یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں اس کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں --- ہم اس بنیادی اصول سے آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور ایک ہی ریاست کے شہری ہیں''۔

تاہم تحریک تقسیم کے دوران جو پرتاثیر اشارے، محاورے اور مثالیں انہوں نے لوگوں کے جذبات ابھارنے کے لیے استعمال کی تھیں وہ پہلے ہی اپنا نقصان پہنچا چکی تھیں۔ پاکستان میں خالص اسلامی نظریے کے حامیوں نے فوراً جناح کے اس نظریے کو چیلنج کیا اور یہ دلیل دی کہ اگر اس نئی ریاست کو سیکولر بنانا تھا تو نئے آنے والے مسلمانوں کو بھارت سے ایسی ریاست کی طرف ہجرت کرنے کی ضرورت نہیں تھی جو پہلے ہی سے سیکولر ہے۔ اس تنقید کے سامنے جناح کی خاموشی نے پاکستان میں سیکولرازم کو مستقل طور پر چیلنج کرنے والے اسلامی گروپوں کو پروان چڑھانے میں بنیادی کردار ادا کیا اگرچہ یہ گروپ ابتدائی عشروں کے دوران قومی سیاست میں کبھی غالب نہیں ہو سکے لیکن اس کے باوجود وہ اتنے نمایاں اور مؤثر ضرور رہے کہ سول اور فوجی حکومتوں نے مختلف ادوار میں اپنے مقاصد کے لیے انہیں کامیابی سے استعمال کیا۔

پاکستان میں انتہاء پسند اسلامیت کی موجودگی کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو بنیادی طور پر یہ فوج ہی ہے جو حالیہ عشروں میں اس کی تیز رفتار نشوونما اور ترقی کی ذِمہ دار ہے۔ دراصل وہ دو واقعات جنہوں نے انتہاء پسند اسلامی گروپوں کو مستحکم کیا۔ وہ فوجی حکومت کے عہد حکومت میں واقع ہوئے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق (۱۹۷۷-۱۹۸۸ء) نے اپنی حکومت کو جواز مہیا کرنے، عوامی مخالفت کو کم کرنے اور افغانستان میں روس مخالف جنگ کے لیے وقف فوجیوں کو تیار کرنے کے لیے پورے ملک میں اسلام کا نعرہ لگایا۔ پھر حال میں مشرف نے بھی بڑی سیاسی پارٹیوں کو تباہ کرنے کی ایک کوشش میں جو ۲۰۰۲ء کے انتخابات کے دوران اس کے اقتدار کے لیے خطرہ تھیں، اسلام پسند اتحاد کو مسائل سے گھرے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پہلی بار قومی سطح پر نمایاں مقام عطا کیا ہے۔

جس چیز نے ناقابل تلافی طور پر پاکستانی معاشرے کی سماجی ساخت کو بگاڑ کے رکھ دیا ہے وہ ۱۹۹۰ء سے فوج کا کشمیر اور افغانستان میں انتہاء پسند اسلامی گروپوں کو جہاد کے لیے قصداً استعمال کرنا ہے۔ فوج کے اس مؤقف نے کہ کشمیر میں جہاد مبنی بر انصاف اور ضروری ہے اور یہ کہ پاکستان کو اپنے مغرب میں ایک ایسی دوست حکومت کی ضرورت ہے جو بھارت کی مخالف ہو، فوج کے متبادل مسلح اسلامی گروہوں کو بہت بڑھایا ہے۔ سوچا یہ گیا تھا کہ یہ گروہ ملک کی شرقی اور غربی دونوں سرحدوں پر پاکستان

کے مفاد میں حکمت عملی کو بہتر بنائیں گے۔ لیکن عملاً ہوا یہ ہے کہ مذکورہ گروہ نہ صرف بھارت بلکہ اسرائیل اور امریکہ کو اپنا دشمن خیال کرتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ خود پاکستانی فوج کے سیکولر عناصر کو بھی ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔ گزشتہ بیس سالوں کے دوران پاکستان میں غربت کے ڈرامائی پھیلاؤ نے، جو معاشی بدانتظامی اور جنگی معیشت کے ساتھ ساتھ جمہوری اداروں کو کمزور کرنے کے عمل کا نتیجہ ہے، ان گروہوں کے اثرات کو مزید مضبوط بنا دیا ہے۔

اس طرح بحیثیت ایک ریاست جہاں پاکستان کی تشکیل جدید نہ صرف حکمت عملی، معیشت اور سیاسی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں وہاں ساتھ ہی پاکستانی معاشرے کو حیاتِ نو بخشنے کی بھی متقاضی ہے۔ پاکستان کو ایک ایسے فعال سول معاشرے کی ضرورت ہے جو ایک تنگ نظر اور مخصوص نظریے کا حامل ہونے کی بجائے صرف ثقافتی معنوں میں مسلم ہو۔ اس ہدف کو حاصل کرنا بہت مشکل ہو گا۔ پانچ عشروں کی خرابیوں اور بگاڑ نے ان سماجی مشکلات کو دو چند کر دیا ہے اور انہیں پاکستان کی حکمت عملی، معیشت اور حکمرانی میں روز افزوں ناکامیوں کی خباثتوں سے مربوط کر دیا ہے۔ چیلنجوں کی نوعیت کا انتہائی پیچیدہ ہونا تسلیم لیکن کئی مسائل ایسے ہیں جو براہ راست اور مرتکز سرگرمیاں چاہیں گے۔ ان میں مرد وعورت میں عدم مساوات کی اصلاح، نظریاتی محاذ کی بہتری، سول معاشرے کی نمو اور ریاستی کنٹرول کے پھیلاؤ کو قابو کرنا ہے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ناگزیر کم از کم اقدامات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے: مدرسوں کو منظم کرنا، ان کی تشکیل جدید کرنا اور انہیں اپنے قابو میں لانا جیسا کہ مشرف نے ابتداء میں چاہا تھا؛ ۱۹۹۰ء کے بعد کے فوجی منصوبوں کے مطابق مسلح کیے گئے گروہوں کو آہستہ آہستہ غیر مسلح کرنا؛ صحت اور تعلیم بالخصوص دیہاتی علاقوں میں عورتوں کی تعلیم کے شعبوں میں سرمایہ کاری، سیاسی پارٹیوں، طلباء تنظیموں، اخبار اور میڈیا کی دوسری تنظیموں اور حکومتی اداروں کی مضبوطی کے لیے این جی اوز کے ذریعے اور ان کے ساتھ مل کر سرمایہ کاری کرنا؛ وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں میں ترقیاتی پروگراموں کی منصوبہ بندی کرنا۔ قبائلی علاقے بالخصوص اس لیے کہ ایک تو ان پر اسلام آباد کا کنٹرول کمزور ہے اور دوسرا اس لیے کہ یہ علاقے ابھی تک القاعدہ اور طالبان کے اہم مراکز کے طور پر باقی ہیں۔

المختصر یہ اسٹریٹیجک، معاشی، سیاسی اور سماجی حل ان اقدامات کا محض ایک پرتو ہیں جو پاکستان کو ایک

اعتدال پسند ریاست میں ڈھلنے کے لیے مطلوب ہیں۔ جب ان پر تمام جہات سے غور کیا جائے گا تو یہ سارے حل کچھ مشترک خصوصیات کے حامل نظر آئیں گے۔ مثلاً یہ وسائل اور سیاسی عزم کے لحاظ سے بہت مہنگے اور پیچیدہ ہیں اور ان کا آغاز اور نفاذ بنیادی طور پر خود پاکستانیوں کو کرنا چاہیے اس سے قطع نظر کہ دوسرے ممالک ایک معاون کا کردار ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں البتہ یہ تمام حل پاکستان کو ایک صحت منداور اعتدال پسند مسلم ریاست میں ڈھالنے کے لیے اپنی متعلقہ اہمیت، اثر پذیری اور کامیاب نفاذ کے لیے مطلوب مدت کے لحاظ سے مختلف ہیں۔

**امریکہ کا کردار:** پاکستانی ریاست کو اعتدال پسند، مستحکم اور جمہوریت دوست بنانا ایک کٹھن کام ہے۔ اس راستے کی مشکلات کا تقاضا ہے کہ امریکی امداد کی پیشکش کا فیصلہ کرتے وقت واشنگٹن مسائل کے صرف ایک مختصر مجموعے پر اپنی توجہ مرکوز کرے۔ پاکستان کو دہشت گردی میں شمولیت سے کیسے دور کیا جائے؟ اس سلسلے میں ۱۱/۹ کمیشن کی تجاویز کچھ رہنما اصول پیش کرتی ہیں لیکن وہ ناکافی ثابت ہوسکتی ہیں۔ ''امداد کی موجودہ سطح کو برقرار رکھنا'' اور ''ایک جامع کوشش جس کا رُخ فوجی امداد سے بہتر تعلیم کی طرف متعین ہو سکے'' کو شروع کرنا لازمی امور ہیں لیکن یہ اسلام آباد میں حکمرانی کی ساخت کو بدلنے کے لیے متبادل نہیں ہو سکتے۔ کمیشن رپورٹ کا نتیجہ کہ ''مشرف حکومت پاکستان میں استحکام کے لیے بہترین امید پیش کرتی ہے'' انتہائی پریشان کن ہے۔ اگر چہ مستقبل قریب میں تو یہ درست ہے لیکن اس مفروضے پر مبنی امریکی پالیسی کو پاکستانی فوج کی طاقت اور انٹیلی جنس سروسز کو بہتر بنانے کے لیے طویل المیعاد اثرات پر نظر رکھنی ہوگی جن میں سے ہر ایک نے دہشت گردی کو پروان چڑھایا ہے اور اسے پاکستان کے پہلے ہی سے تباہ شدہ سول سیاسی اداروں کی قیمت پر حاصل کرنا ہوگا۔

جہاں امریکہ ایسی پوزیشن میں ہو کہ اُسے اپنا تقابلی فائدہ نظر آرہا ہو یا اس کے دوسرے مفادات نمایاں اہمیت رکھتے ہوں وہاں متبادل اقدامات کا انتخاب کرنا چاہیے۔ یہ بات قابل فہم ہے کہ ایسے متعدد معاملات ہوں گے جو امریکی توجہ اپنی طرف مبذول کر سکتے ہیں اور جہاں مختلف النوع امریکی نجی، حکومتی اور بین الاقوامی مدد کا تعلق ہوسکتا ہے۔ اس کے باوجود واشنگٹن کو اپنی توانائیاں اصولاً ان اساسی مسائل پر صرف کرنی چاہئیں جو تقابلی مفادات یا متعلقہ اہم امور کی کسوٹی پر پورا اُترتے ہوں مثلاً پاکستان کی ایٹمی

قوت کو محفوظ بنانا اور اسلام آباد کے ساتھ ایک عظیم تر منصوبے کے تحت پاکستان میں جمہوریت کو بحال کرنا جو پاک امریکی تعلقات کو طویل عرصے کے لیے مستحکم کر سکیں۔

**پاکستان کی ایٹمی طاقت کو محفوظ بنانا:** پہلا اور انتہائی اہم مسئلہ جس پر امریکہ کو اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے وہ پاکستان کی ایٹمی ٹیکنالوجی کو پھیلنے اور اس کے ایٹمی ہتھیاروں پر کنٹرول کے نقصان کو روکنا ہے۔ یہ مسئلہ امریکی سکیورٹی کو براہ راست متاثر کرتا ہے اور یہ اس خطے میں ہے جہاں امریکی امداد ایک اہم تبدیلی لا سکتی ہے۔

مختصر یہ کہ امریکہ کو چاہیے کہ وہ پاکستانی حکومت سے ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے متعلق عبد القدیر خان کے نیٹ ورک کی سرگرمیوں کا مکمل حساب کتاب حاصل کرے جس میں اس بات کی مکمل تفصیل شامل ہو کہ کیا چیز منتقل کی گئی اور کس کس کو منتقل کی گئی۔ اس بات کی بھی یقین دہانی کروائی جائے کہ پاکستان اس کے کھلے عام پھیلاؤ کے اعادے کو روکنے کے لیے مناسب فنی، تنظیمی اور باقاعدہ حفاظتی اقدامات کرے گا۔ بش انتظامیہ نے اسلام آباد کے ساتھ ان دونوں مسئلوں پر بحث کا آغاز کیا تھا لیکن امریکی اور بین الاقوامی تشویش کو مکمل طور پر اطمینان نصیب ہونا ابھی بہت بعید ہیں۔

وسطی مدت یا تقریباً چار سالوں میں امریکہ کو پاکستان کی اس انداز میں مدد کرنی چاہیے کہ وہ اپنی تمام اسٹریٹیجک تنصیبات کا تحفظ کر سکے اور حساس مواد سے متعلق اپنی کوتاہیوں کو دور کرے۔ یہ کوشش حساس مشقوں اور ایٹمی ہتھیاروں کے تحفظ پر فوجی رہنمائی کی صورت میں کی جانی چاہیے۔ جوہری مواد کے حساب کتاب کے لیے قبل از وقت آلہ جات، نگرانی کا ساز و سامان، پھاٹک کنٹرول سامان، گزرگاہیں اور جدید ٹیکنالوجی فراہم ہو گی جو پاکستان اسٹریٹیجک پلان ڈویژن (Pakistan Strategic Plan Division) کے مؤثر اور قابل اعتماد پروگراموں کو ترقی دینے میں مددگار ہو گا۔ اور اس سے حساس معلومات کے ظاہر ہونے کے امکانات محدود کرنے میں مدد ملے گی۔ پاکستانی ایٹمی طاقت کے موجودہ حجم سے قطع نظر اگر امریکہ آج اس مدد کی پیش کش کرے تو بھی اس کے مکمل طور پر عملی جامہ پہنائے جانے اور اس کے مؤثر ہونے کے لیے کچھ وقت لگے گا۔ بش انتظامیہ ان معاملات پر پاکستان کے ساتھ ابتدائی ملاقاتوں کا انتظام کر چکی ہے لیکن امریکی ارادوں سے متعلق پاکستان کے شکوک و شبہات اور اس کے ایٹمی

اثاثہ جات کی حفاظت کے سمجھوتے کے بارے میں موجود خدشات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ شاید سر دست امریکی فنی اعانت سے مکمل طور پر استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال واشنگٹن کو نہ صرف یہ کوشش جاری رکھنی چاہیے بلکہ ان کوششوں کو مزید تیز کرنا چاہیے۔

سست روی سے جاری حمایت کے علاوہ امریکہ کو پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کے ناجائز استعمال سے متعلق خوف دور کرنے کے لیے بھی مدد کرنی چاہیے۔ یہ مدد امریکہ کے لیے ایک مزید ممکنہ خطرہ کو کم کرنے اور علاقائی سلامتی کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوگی۔ عالمی سطح پر پائے جانے والے خدشات کے باوجود چوری یا آوارہ ذرائع سے حاصل کردہ جوہری مواد کے ناجائز استعمال کا امکان زمانۂ امن میں نسبتاً کم ہے کیونکہ اسلام آباد کی ایٹمی ایجادات انتہائی اہم جگہوں پر مختلف حصوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔ تاہم نازک حالات میں جب ان اہم اجزاء کو مطلوبہ ہتھیاروں سے مربوط کر دیا جائے اور میدان جنگ میں پھیلا دیا جائے تو نقصان، قبضے یا ناجائز استعمال کے خدشے میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

جس حد تک ممکن ہو، امریکی تحفظ سے وابستہ مفادات اس بات کا تقاضہ کرتے ہیں کہ ان خدشات سے پیدا ہونے والے امکانات کو کم کیا جائے جو مستحکم مزاحمت کے لیے پاکستان کے اپنے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ واحد حل جو دونوں کے مقاصد پورے کر سکتا ہے وہ مشترکہ فنی کنٹرول ہے جس کا لازمی مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہوگا کہ امریکہ پاکستان کو جوہری میدان میں ایک نوآموز کھلاڑی کی حیثیت سے "عملی اقدام کے لیے مجاز رابطہ" [Permissive Action Links] مہیا کرنے پر توجہ دے، تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ یہ ہتھیار اگر کبھی غائب ہو جائیں یا ناپسندیدہ عناصر کے ہاتھ لگ جائیں تو ان کا استعمال ممکن نہ رہے۔ یہ معاملہ اس بات کا متقاضی ہے کہ بین الاقوامی حکومتوں اور کسی حد تک داخلی قوانین کے حوالے سے مروجہ امریکی پابندیوں کی اصلاح ہو لیکن اسلام آباد کے ہتھیاروں پر مضبوط فنی کنٹرول حاصل کرنے کے لیے ایسے اقدامات ضروری ہیں تاکہ باہمی مفادات کو فروغ ملے اور علاقائی امن کو بھی آگے بڑھایا جا سکے۔

ایک طویل المیعاد حکمت عملی کے طور پر پاکستان کے ایٹمی ذخائر کے تحفظ سے متعلق جیسے جیسے امریکہ پر پاکستانی اعتماد بڑھے گا ویسے ویسے باہمی احترام کی فضا بحال ہوگی۔ چنانچہ واشنگٹن کو ایٹمی ایمرجنسی کی

صورت میں معاونت کے ترقیاتی منصوبوں پر اسلام آباد کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔اس طرح کے منصوبوں کو مختلف اتفاقی واقعات کو کنٹرول کرنا چاہیے۔ان واقعات میں وہ کوششیں بھی شامل ہیں جو ایٹمی ہتھیاروں یا مواد کی چوری کے لیے کی گئی ہوں یا حساس اشیاء کی کامیاب چوری کی ہوں یا مواد کے حساب کتاب، کنٹرول اور خصوصی سہولتوں پر حفاظتی انتظامات میں ڈرامائی کمزوریوں کی دریافت کے لیے ہوں۔ دوراندیشی کا تقاضا ہے کہ اس طرح کے اتفاقی حادثات سے فوری نمٹنے کے لیے امریکہ کو اپنے طور پر بھی منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔

## پاکستان میں جمہوریت کی بحالی

پاکستان میں جاری انحطاط کی تشویشناک صورت حال امریکی سیکورٹی پر پہلے سے زیادہ مہلک انداز سے اثر انداز ہونے کی دھمکی دیتی ہے۔آج پاکستان ایسے مختلف مسلح اسلامی گروپوں سے آباد ہے جو امریکی مفادات پر تباہ کن حملوں کی صلاحیت اور خواہش دونوں کے مالک ہیں۔ یہ دہشت گرد گروپ پاکستانی فوج کی پشت پناہی میں اس وقت تک اپنا وجود برقرار رکھیں گے جب تک پاکستان بھارت کشمکش میں ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ایک مختصر مدت کے لیے ان دہشت گرد عناصر سے نمٹنا زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ پاکستانی فوج کو ان عناصر سے بالآخر کیسے دور کیا اور رکھا جائے۔اس امر کو اس وقت تک یقینی نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ پاکستان ایک لبرل سیاسی نظام کے ساتھ جمہوری حکومت کے مضبوط اداروں کو ترقی نہ دے۔ یہ بلاشک وشبہ ایک بددل چیلنج ہے۔پاکستان میں جمہوریت سازی کا عمل اپنے گرد جس طرح کے مطالبات کی کثرت میں گھرا ہوا ہے ہر امریکی حکومت اس کی قدامت پرستی سے خوفزدہ ہو چکی ہے کیونکہ ہر موقع پر امریکی حکومتیں انتہائی ضروری مسائل کے حل کے لیے، جہاں اسلام آباد کا تعاون شاید اہمیت کا حامل ہو، موجودہ پاکستانی فوجی حکومت کے ساتھ مذاکرات کو ترجیح دے چکی ہیں۔لیکن پاکستان میں انتہا پسندی کی برف پگھلنے کی امید، جس کا بہت کم امکان ہے، بہرصورت امریکہ کی نگرانی میں بالکل پوری نہیں ہو سکتی۔

۱۱ستمبر کے حملوں کے بعد پاکستان اور اس کے اردگرد اسلامی گروپوں کی طرف سے جاری

انتہا پسندی پر غفلت برتی گئی۔ واشنگٹن کو آج اپنی توجہ مشرف کو چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے سے دستبرداری کے لیے قائل کرنے پر مرکوز کرنی چاہیے اور پاکستانی سیاسی زندگی میں غیر فوجی سیاست دان کی حیثیت سے کام کرنے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشرف کی متبادل سیاسی شخصیت پر غور کرنا چاہیے جو مکمل غیر فوجی حکومت کی بحالی کی جانب ایک بڑے ارتقاء کا لازمی حصہ ہے۔ یہ بحالی واشنگٹن کا بنیادی مقصد اور آنے والے چار سالوں میں پاکستان کی داخلی اصلاح سے متعلق ہونا چاہیے۔ تاکہ پاکستان میں غیر فوجی اور سیاسی حکومت کو قبول کیا جا سکے اور ۱۹۷۳ء کے آئین (ضروری تبدیلی کے ساتھ، اگر ناگزیر محسوس ہو) کو بنیادی زمینی قانون کے طور پر بحال کیا جا سکے۔

پاکستان میں تبدیلی کا عمل نئے رولز آف گیم کی مستحکم حد بندی کا تقاضا کرتی ہے تاکہ سیاسی پارٹیوں، غیر سرکاری تنظیموں، (NGOs) ذرائع ابلاغ اور دیگر سماجی اداروں کی صورت میں غیر فوجی معاشرے کو فروغ دیا جائے اور اسے بااختیار بنایا جائے۔ امریکہ جو یہ کام کر سکتا ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے، پہلے سے ہی ان اداروں کی ترقی کے لیے اپنے سرکاری تعاون کی نئی صف بندی کر کے اور مزید وسعت دے کر مدد کا آغاز کر چکا ہے۔ واشنگٹن کو مدارس کی رجسٹریشن مکمل کرنے اور ان کے نصاب تعلیم کی اصلاح کے لیے بھی پاکستان پر دباؤ ڈالنا چاہیے بلکہ ان اداروں کی معاشی مدد بھی ترک کرنی چاہیے۔ عام طور پر امریکی معاشی مدد قرض معافی پر مرکوز نہ ہو تاکہ پاکستان اپنے پرانے فیصلوں کی بنیاد پر کچھ ذمہ داری اٹھائے اور خاص طور پر دیہی علاقوں میں اہم انسانی اور معاشرتی تعمیر میں مفید سرمائے اور مناسب اخراجات کے تصور کو اجاگر کرے۔ دوستوں اور نجی حلقے کے ساتھ مل کر وفاق کے زیر انتظام پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ترقیاتی کاموں کا فروغ خوش آئند ہوگا مثلاً سکول، سڑکیں اور ابتدائی ہیلتھ سنٹر وغیرہ۔

## پاکستان سے ایک بڑے معاہدے کے خدوخال

ایک مستحکم پاک امریکہ تعلق دونوں ممالک کے طویل المیعاد مفادات سے وابستہ ہے۔ پھر یہ تعلق جنوبی ایشیا میں بڑے امریکی مقاصد کے لیے بھی مفید ہے جس میں وہ پاک بھارت جنگ کے خطرات کو کم کرنے اور امریکہ بھارت تعلق کو مستحکم تر کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے تاکہ ایشیا میں طاقت کے دائمی و مضبوط

توازن کو برقرار رکھا جا سکے۔ ہر چند کہ پاکستان دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے، واشنگٹن کے لیے پاکستان کے ساتھ طویل مدت تک تعلق قائم رکھنے میں مشکل پیش آئے گی تاوقتیکہ پاکستان سیکورٹی اور خصوصاً خارجہ سیکورٹی سے متعلق امریکی تحفظات پر اپنی توجہ مرکوز نہ کرے۔ دوسری طرف پاکستان میں بڑھتی ہوئی جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ واشنگٹن پاکستانی فوجی قیادت کے مقابلے میں جمہوری ترقی کو اولیت دے لیکن پاک فوج غالباً اس وقت تک مطلوبہ اقدامات سے گریز کرتی رہے گی جب تک پاک سیکورٹی کے حوالے سے کوئی بڑا امریکی معاہدہ طے نہ پا جائے۔

تاہم پاکستانی حکومت کی مدد کے باوجود اس کی خارجہ سیکورٹی سے متعلق مسائل امریکہ کے لیے انتہائی مشکل جدوجہد اور ایک چیلنج کے طور پر باقی رہیں گے۔ ایک گھمبیر مسئلہ امریکی اور پاکستانی ترجیحات کے درمیان ٹکراؤ کا باقی رہنا ہے اور بالخصوص کشمیر سے متعلق پاکستان کی پالیسیاں اور اس کے انڈیا کے ساتھ تعلقات کا معاملہ۔ امریکہ ظاہر ہے اسی بات کو ترجیح دے گا کہ کشمیر سے متعلق امور میں پاکستان پُرامن ذرائع استعمال کرے اور اس مقصد کے لیے دونوں ممالک مذاکرات کا راستہ اختیار کریں۔ لیکن اسلام آباد یہ سوچی سمجھی رائے رکھتا ہے کہ اگر وہ کشمیر میں دہشت گردی کو ہوا نہ دے تو نیو دہلی پاکستان کو نظر انداز کرے گا اور ریاست کی مخالف آبادی کے ساتھ داخلی معاہدے کے ذریعے اس تنازعہ کے حل کی کوشش کرے گا۔ مزید یہ کہ ۱۹۸۰ء کے دوران افغانستان میں روس کا تجربہ پاکستانی فوج کو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ کم شدت کی لڑائی انڈیا کو کشمیر سے نکال سکتی ہے یا کم از کم نیو دہلی کو اہم رعایتوں کے وعدے کے ساتھ مذاکرات کی میز پر لا سکتی ہے۔

اگر امریکی پالیسی اس پاکستانی حکمت عملی سے اتفاق کرتی ہے تو یہ دہشت گردی کے خلاف جاری عالمی جنگ کے بنیادی اخلاقی اصولوں کو تباہ کرنا ہوگا؛ اور انڈیا کے ساتھ حکمت عملی کی شراکت کو ترقی دینے کی واشنگٹن کی کوشش کو روکنا ہوگا؛ اور اس سے ایک شدید پاک بھارت سیاسی بحران جنم لے گا جس کی نوبت جنگ تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ اس کے برعکس اگر امریکہ کشمیر میں پاکستانی حمایت یافتہ دہشت گردی کے خلاف انڈیا کی جدوجہد کا جارحانہ انداز میں ہاتھ بٹاتا ہے تو ممکن ہے کہ اس سے پائیدار عالمی امن کے لیے جاری کوششوں میں اسلام آباد کے تعاون میں کمی آئے۔ اس سے یقیناً پاکستان واشنگٹن کو اپنے تحفظ

سے متعلق تشویش کے بارے میں بے حس سمجھے گا اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اِس وقت تک مہیا کی جانے والی تمام پاکستانی امداد کا ناشکرا سمجھے گا۔

ان باہم مخالف دباؤ کی صفر کارکردگی نے امریکہ کے لیے پاک بھارت تعلقات کو منظم کرنا بہت مشکل چیلنج بنا دیا ہے۔ وہ بہترین صورت جس کی امید کی جاسکتی ہے یہ ہے کہ مخالف دباؤ کی شدت کو کم کیا جائے لیکن مختصر مدت میں مطلوبہ کمی کا حصول ایک پیچیدہ حکمت عملی کا تقاضا کرتا ہے یہ کمی اولاً امریکہ کو انڈیا کے خلاف مستقل بنیادوں پر دہشت گردوں کی دراندازی روکنے کے لیے پاکستان پر دباؤ جاری رکھنا ہوگا جو نیو دہلی کو مذاکرات کی میز پر موجود رہنے کے لیے محرک کا کام دے گا۔ پھر حالیہ جاری مذاکرات کا عمل خوش آئند ہے چنانچہ امریکہ کو چاہیے کہ وہ باہمی تجارت کو فروغ دیئے؛ لوگوں کے باہمی رابطوں کو بڑھانے؛ ٹرانسپورٹ کے وسائل کو ترقی دیئے؛ اور ثقافتی تبادلوں کے لیے پاکستان اور انڈیا دونوں کی حوصلہ افزائی کرے تاکہ دونوں کے باہمی مفادات میں اضافہ ہو اور آخر میں یہ کہ واشنگٹن کو انڈیا پر دباؤ ڈالنا چاہیے کے وہ جموں وکشمیر میں سیاسی اور معاشی حالات کی بہتری، وہاں اپنی فوجوں کی جانب سے جاری مظالم کو روکنے اور غیر متاثر آبادی کے نمائندوں کے ساتھ سنجیدہ مکالمے کا آغاز کرے۔ تاکہ اسلام آباد کی برہمی کو دور اور پاکستانی جذبات کو ٹھنڈا کر کے اشتعال انگیز اقدام سے باز رکھا جاسکے۔

تاہم یہ اندازِ فکر جو موجودہ امریکی پالیسی کی نمائندگی کرتی ہے محض عارضی تسکین فراہم کرے گا۔ بنیادی مسئلہ مقاصد اور اغراض کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ پاکستان بنیادی طور پر کشمیر کی موجودہ حالت کی تبدیلی کے لیے انڈیا کے ساتھ مصالحتی مذاکرات کی خواہش رکھتا ہے جبکہ انڈیا ابتدائی طور پر اپنے استحکام کے لیے مذاکراتی عمل کو قبول کرتا ہے۔ دونوں اطراف کے درمیان متعلقہ صلاحیت ناپید ہونے کی وجہ سے یہ معمہ ناقابل حل ہے۔ پاکستان ایک ایسی ریاست ہے کہ جو انتہائی سختی سے صورت حال کی تبدیلی پر یقین رکھتی ہے لیکن اس کے پاس متنازعہ علاقے کے کنٹرول پر انڈیا سے جبراً ہتھیار ڈالوانے کے لیے کوئی پرامن راستہ نہیں ہے۔ دوسری طرف بھارت پہلے سے ہی خوبصورت علاقے پر قابض ہے اور اس کو ہتھیانے کی کسی بھی پاکستانی کوشش کا مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے جب تک ان میں سے کوئی ایک ملک اپنی حکمت عملی کے بڑے مقاصد کو تبدیل نہیں کرتا کشمیر پر پاک بھارت تنازعہ کسی بھی حل سے

معذور رہے گا۔

کشمیر میں انڈیا کو اپنے مقاصد تبدیل کرنے کے لیے امریکہ کے پاس نہ تو ترغیبات ہیں اور نہ ہی وہ اسے مجبور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے پاکستان کے ذرائع اس کے اپنے اور امریکی دفاع دونوں کے لیے خطرہ بن چکے ہیں چنانچہ امریکہ کو اسلام آباد پر ضرور اثر ڈالنا چاہیے۔ اس لیے اگلے چار سالوں کے دوران امریکی انتظامیہ کشمیر میں پاکستانی مقاصد کو لازماً تبدیل نہیں کروائے گی بلکہ اسے پاکستان سے کم از کم ۱۹۹۴ء سے جاری ان ذرائع کو تبدیل کروانا ہوگا جس میں سب سے زیادہ خطرناک دہشت گرد اسلامی گروپوں کو بے لگام چھوڑ دینا ہے۔ واشنگٹن مختلف ذرائع سے اپنا پیغام دوبارہ مؤثر بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے: اولاً اپنے معاشی امدادی پروگرام کو اس وقت تک برقرار رکھنا اور اس میں وسعت دینا جب تک پاکستان کشمیر اور افغانستان دونوں میں دہشت گردی اور اس کے پھیلاؤ اور جمہوریت سے متعلق اپنے وعدے پورے کرتا ہے؛ اور ثانیاً پاکستان کے ساتھ امریکی فوجی تعاون بالخصوص فوجی تعلیم اور مشقوں کو بڑھانا اور پاکستان کے پہلے سے موجود ہتھیاروں کے لیے اضافی پرزہ جات فراہم کرنا۔ ثالثاً ایسے اقدامات پر آمادگی ظاہر کرنا جو پاکستان کو دہشت گردی پر قابو پانے، اس کے پھیلاؤ کی روک تھام کرنے اور بامعنی سیاسی اصلاحات اختیار کرنے پر مجبور کرسکیں۔

واشنگٹن اس سمت میں پیش رفت کر چکا ہے لیکن دو بامعنی امتیازات کے ساتھ۔ ہر چند کہ اس نے پاکستان کے لیے ایک بڑے معاشی اور فوجی امداد کے غیر مشروط پروگرام کا آغاز کیا ہے، امریکہ پاک تعلقات کی تاریخ کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی کہ مشروط امریکی امداد کبھی ثمر آور ثابت نہیں ہوئی۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ مشروط امداد کی عدم موجودگی کا مطلب امریکہ کا دباؤ کے ایسے بہترین ہتھیار کو استعمال کرنے سے رک جانا ہے جس سے پاکستان کو دہشت گردی میں شمولیت سے روکا جاسکتا تھا۔ مزید برآں یہ کہ ۱۱ ستمبر کے فوراً بعد دہشت گردی کے خاتمے کے لیے واشنگٹن کا اسلام آباد کو دیا گیا الٹی میٹم محض جزوی طور پر نافذ کیا گیا ہے۔ واشنگٹن نے اسلام آباد سے یہ بات منوائی تھی کہ وہ القاعدہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا وعدہ پورا کرے گا لیکن وہ طالبان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے یا ہندوستان کے خلاف کشمیری دہشت گردی کی حمایت کو مستقل طور پر روکنے کے پاکستانی متضاد رویے کو زیادہ تر معاف کرتا آیا ہے۔ طالبان کی

تشکیل نو کے خطرات اور افغانستان میں امریکی تعمیر نو کی کوششوں کے لیے اس کی دھمکی اور اسی طرح پاکستان اور انڈیا کے درمیان نئی کشمکش کے لیے دوبارہ سے اٹھنے والی کشمیری دہشت گردی کے نتائج جو کہ پائیدار آزادی کے اقدام کے لیے مہلک ہیں امریکہ کو اس بات پر بہر حال مجبور کرتے ہیں کہ وہ پاکستان سے متعلق اپنی موجودہ پالیسی کی تشکیل نو کے لیے غور کرے۔

ان بہت بڑے چیلنجوں کے باوجود اگر امریکہ انڈیا کو نظر انداز کیے بغیر پاکستان کے ساتھ ایک مضبوط اور طویل المیعاد تعلق کو برقرار رکھتا ہے تو اسے لازماً اسلام آباد کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی کہ وہ مکمل غور وفکر کے ساتھ تنازعہ کشمیر کا ایسا مستقل حل تلاش کرے جہاں ایسی ریاست میں رائے شماری کی گنجائش نہ ہو جو پہلے اپنی صوابدید دے چکی ہو اور بہت بڑی علاقائی تبدیلی یا خود ارادیت کی بنیاد پر جنوبی ایشیا کے دو حریفوں کے درمیان کوئی سودے بازی نہ ہو۔ اگر پاکستان کسی ایسے حل کو بطور اساس قبول کرنے پر رضامند ہو تو واشنگٹن کو پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کے جواز پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے موجودہ پالیسی کی حدود کے اندر پرامن ایٹمی تعاون کی پیش کش کرنی چاہیے۔ اسلام آباد کو میزائل ڈیفنس دینے چاہیں۔ پاکستان کو روایتی فوجی اسلحہ کے پرزہ جات رعائتی نہیں بلکہ تجارتی بنیادوں پر مہیا کرنے چاہیں اور اسی طرح امریکہ پاکستان کو طویل مدتی اقتصادی تعاون کی اتنی ضمانت دے جتنی سادات بیگن معاہدہ کے بعد مصر کو مہیا کی گئی تھی۔

اس طرح کا بڑا سمجھوتہ پاکستانی تحفظ کو طویل المیعاد امریکی تعاون فراہم کر سکتا ہے بشرطیکہ پاکستان، بھارت کے ساتھ اپنی مستقل حالت جنگ کو ختم کرنے کے لیے تیار ہو۔ اس طرح کے انتظام کی کامیابی زیادہ تر اس بات پر منحصر ہے کہ آیا پاکستان جمہوریت، معاشی استحکام اور اعتدال پسند سیاست کی جانب اپنی داخلی تبدیلی کا آغاز کرتا ہے یا نہیں۔ اگر اسلام آباد ایسا کرنے کی ٹھان لے تو امریکہ کے لیے ایک طویل المیعاد پاک امریکہ تعلقات کے خطرات کم ہوں گے اور ممکنہ امریکہ بھارت تعلقات میں گرمجوشی آسکتی ہے جس کی مخالفت ایک جمہوری پاکستان کے لیے غالباً ناممکن ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان امریکہ کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکے گا کہ وہ ماضی کی طرح پاکستان یا انڈیا دونوں میں سے کسی ایک کی حمایت کا انتخاب کرے۔ تاہم اچھے دنوں میں بھی اتنے بڑے سمجھوتے کا مکمل کامیابی سے اپنے

انجام کو پہنچنا غالباً بہت مشکل ہے کیونکہ یہ بات امریکہ سے اس امر کا مطالبہ کرتی ہے کہ وہ پاکستان کو ایسے نتائج پر آمادہ کرے جسے پاکستانی ریاست کا طاقتور ترین طبقہ یعنی فوج بھی قبول کر سکے!! امریکہ شاید تصوراتی حد تک پاکستان کو اس سمت میں چلانے کی صلاحیت تو رکھتا ہے لیکن آزادی کی پائیداری کے اقدام (Operation Enduring Freedom) کو مکمل کرنے کے لیے مشرف حکومت پر امریکی انحصار سوالیہ نشان ہے اور اس نظریے کو عملی طور پر نافذ کرنے میں مانع ہے۔

جیسا کہ ڈینس ککس (Dennis Kux) نے امریکہ پاکستان تعلقات پر تاریخی شہادت سے یہ واضح کیا ہے کہ ضرورت کے مختصر المیعاد دباؤ نے روایتی طور پر ایسی پریشانیوں کو جنم دیا ہے جو انجام کار میں انتہائی اہم ثابت ہو سکتی ہیں۔ چونکہ واشنگٹن کو دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے اسلام آباد کی فوجی حکومت کے تعاون کی ضرورت ہے اس لیے اس بات میں انتظامیہ کے لیے ترغیب یہ ہے کہ وہ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی پر اپنی توانائی کو مرکوز نہ کرے بلکہ اس کی بجائے فوجی حکومت کے تسلسل پر خاموشی سے راضی رہے۔

دراصل امریکہ اور مستقبل کے پاکستانی غیر فوجی لیڈروں کو بھی لامحدود ساختی تبدیلی کے ایجنڈے کو زیر التواء رکھنے سے بچنا چاہیے۔ پاکستان کی کئی سابقہ فوجی اور نگران حکومتوں نے بلاشبہ اہم مگر جزوی اصلاحات شروع تو کیں مگر وہ بدقسمتی سے برقرار نہ رہ سکیں کیونکہ جمہوری حکمرانی سے متعلق بنیادی مسائل حل نہیں کیے گئے تھے۔ جب تک پاکستان اور امریکہ تاریخ سے یہ سبق سیکھ نہیں لیتے، پاکستان طویل المیعاد دفاعی خطرات کا ایک مسلسل بڑھتا ہوا منبع و مرکز بنا رہے گا۔

[آشلے جے ٹلس واشنگٹن ڈی سی میں "کارنیگی انڈوومنٹ فار انٹرنیشنل پیس" میں سینئر ایسوسی ایٹ ہیں۔]